ہم مسلمان اگر ایک سخت ایمان دارانہ محاسبہ پر آمادہ ہوسکیں تو ہمیں شاید یہ سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے کہ اہل قبلہ کے مختلف گروہوں نے جس چیز کو وثوق واعتماد سے تھام رکھا ہے وہ دراصل حبل اللہ نہیں بلکہ حبل الرجال یا حبل الاحبار ہے۔ وہ دین جو یہودی نصرانی جیسی شناختوں کو لائق استراد ٹھہراتا ہو اور جسے یہ بھی گوارا نہ ہو کہ متبعین محمدؐ خود کو محمدی کی حیثیت سے پیش کریں بھلا اس دین میں اس بات کے لئے کیسے گنجائش نکل سکتی ہے کہ متبعین محمدؐ خود کو حنفی شافعی، شیعہ سنی یا تحریکی اور جماعتی کہلانا گوارا کرلیں۔ ربانی معاشرے میں ان غیر ربانی شناختوں کا ظہور گویا اس بات سے عبارت ہے کہ قرآن مجید نے جس حبل اللہ کو سختی سے تھامے رہنے کی تلقین کی تھی وہ اب ہمارے ہاتھوں سے بدقسمتی سے پھسل گئی ہے۔

۱۱

مسئلہ فلسطین پر ایک نئی پہل کی ضرورت

مسلمان اپنے تمام تر فکری زوال اور ملّی انحطاط کے باوجود اس نکتے سے نا آگاہ نہیں کہ دنیا میں قیام امن کی ذمّہ داری دوسری اقوام کے مقابلے میں ان پر کہیں زیادہ عائد ہوتی ہے۔ آخری رسولؐ کی امّت کی حیثیت سے تاریخ کے آخری لمحے تک متبعیّن محمدؐ کو رحمتہ للعالمینی کا فریضہ انجام دینا ہے گویا دنیا میں اب خیر کے تمام معرکوں کی قیادت ان ہی کو کرنی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو جب خدا کے آخری پیغام کی تکمیل کا شرف انھیں حاصل ہے۔

مسلمان اگر اس نظری منصب پر فائز ہوتے اور رحمتہ للعالمینی کے فلاحی پروجیکٹ میں ان کا اقدامی (pro-active) رویّہ برقرار رہتا تو آج دنیا کا منظر نامہ یکسر مختلف ہوتا۔ لیکن افسوس کہ اسلام کی ابتدائی چند صدیوں کے بعد سے ہی مسلمانوں میں اس عظیم نبوی منصب کا شعور دھندلا ہوتا گیا، یہاں تک کہ اموی اور عبّاسی سلسلۂ حکمرانی آگے چل کر بڑی حد تک امپائر بلڈنگ کے کام میں لگ گئیں۔ ابتدا میں تو ایسا محسوس ہوا کہ اسلام کی نظری آمیزش اگر خالص نوآبادیاتی پروجیکٹ میں بھی شامل ہو جائے تو اس سے اقوام عالم کی مسیحائی کا بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ اسی نظری آمیزش کا اثر تھا جس نے اسپین کی اموی حکمرانی اور برصغیر کی مغل شہنشاہی پر اخلاقی اور روحانی دبدبہ کو قائم رکھنے میں مدد دی۔ البتّہ اسلام کے یہ مختلف قالب جو عسکری طور پر مختلف زمانے اور مختلف خطّوں میں اپنی اثر انگیزی کا ثبوت دیتے رہے، رفتہ رفتہ اپنے اصل انبیائی قالب سے اتنے دور ہو گئے تھے کہ مسلسل تین سو سالوں کی خون آشام جدوجہد کے باوجود عثمانی ترکوں کی زبردست مزاحمت بھی اس ڈھانچے کو گرنے سے نہ بچا سکی۔ ۱۹۲۴ء میں سقوط خلافت کے بعد جو کریہہ منظر نامہ ہمارے سامنے آیا وہ اتنا بھیانک تھا کہ اس نے بڑے بڑے حقیقت پسندوں کے حواس

معطل کر دیے۔ وہ امّت جو کبھی اقوامِ عالم کی رہنمائی پر مامور تھی، اس کا ایک جسد واحد کے طور پر برقرار رہنا مشکل ہو گیا۔

مسلمانوں میں فکر و نظر کا یہ زوال کوئی نیا عمل نہ تھا البتہ عسکری برتری اور شخصی حکومت کے مختلف سلسلوں نے اس صورت حال پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ عامۃ المسلمین اس خوش فہمی میں جیتے تھے کہ وہ اب بھی محمد رسول اللہ کے انقلاب انگیز پیغام کے امین ہیں اور یہ کہ آج بھی ان کے دم سے دنیا کی مسیحائی وابستہ ہے۔ گو کہ اہلِ نظر ہماری تاریخ کے مختلف دور میں زوالِ فکر و نظر کا شکوہ کرتے رہے ہیں اور ہزیمت کے مختلف موقعوں پر ہمارے یہاں یہ بحث بھی جاری رہی ہے کہ ہم تاریخ کے طویل سفر میں اپنے اصل مشن سے دور جا پڑے ہیں، لیکن پہلی جنگِ عظیم کے بعد امّت کو جس چشم کشا اور لرزہ خیز صورت حال کا سامنا تھا اس نے بڑے بڑے اہلِ فکر کے حواس معطل کر دیے۔

پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کی شکست نے صرف خلافت کے علامتی ادارے کو ہی ختم نہیں کیا بلکہ (Sykes-Picot Treaty) کے اسرار و عواقب نے مسلمانوں کے مقابلے میں یہود و نصاریٰ کے اتحاد کی گویا پہلی اینٹ رکھ دی۔ آگے چل کر ارض فلسطین میں ریاست اسرائیل کا قیام اور پھر آرمیگاڈان کی راہ ہموار کرنے کے لیے خلیجی جنگوں کا سلسلہ اسی نامبارک عمل کا تسلسل ہے جس کے واقعی تحلیل و تجزیے کی کوئی وقیع کوشش سچ پوچھیے تو اب تک عالمِ اسلام میں نہیں ہو سکی ہے۔ مسلم اہلِ فکر نہ صرف یہ کہ صورت حال کی نزاکت سے پوری طرح آگاہ نہیں بلکہ من حیثُ الامّت اب تک اس سلسلے میں ہمارا رویّہ دفاعی نوعیت کا رہا ہے۔ ہم گزشتہ پچاس ساٹھ سالوں سے دوسروں کے اقدامی عمل پر اپنی مزاحمت درج کراتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم مسلسل پسپائی کے شکار خود کو ایک ایسی بند گلی میں پاتے ہیں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سنگین صورت حال کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ گہرائی سے تجزیہ کیا جائے، جب ہی ہم مسئلہ پر کسی اقدامی عمل کی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں۔

مذہبی یہودی اور شدّت پسند عیسائی جو حضرت مسیح کی آمد ثانی کی راہ ہموار کرنے کے لیے مشرق وسطیٰ میں تاریخ کی سب سے بڑی جنگ کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں، دراصل تاریخ کی اساطیری تفہیم کا شکار ہیں۔ اہلِ یہود کو یہ اُمید ہے کہ مسیحا کی آمد ان کی عظمت رفتہ کی بازیابی کا سبب بنے گی، داؤد و سلیمان کی حکومتوں کا سابقہ جاہ و چشم لوٹ آئے گا اور اقوامِ عالم پر اہلِ یہود کی فضیلت دوبارہ قائم ہو جائے گی۔ دوسری طرف عیسائی روایت پرست یہ اُمید لگائے بیٹھے ہیں کہ فلسطین میں یہودی معبد کی تیسری تعمیر سے حضرت مسیح کی آمد ثانی یقینی ہو جائے گی جس کے بعد تاریخ کی کمان کُلی طور پر ان کے متبعین کے ہاتھوں میں ہو گی۔ گویا روایت پرست عیسائیوں کا مفاد اس امر سے وابستہ ہے کہ فلسطین میں بہر طور صہیونی منصوبہ آگے بڑھے۔ روایت پرست عیسائی جو فی زمانہ امریکی سیاسی نظام میں خاصے مؤثر ہیں ارض فلسطین میں ایک فیصلہ کن معرکے کے لیے بڑی سے بڑی قیمت

چکانے کو تیار ہیں۔ اہلِ یہود اور عیسائیوں کے اساطیری اور خلافِ عقل طرزِ فکر نے نہ صرف یہ کہ عالمِ اسلام کو ایک سنگین صورت حال سے دوچار کر دیا ہے بلکہ ان غیر عقلی رویّوں سے عالمی امن کو بھی سخت خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

معاصر دنیا میں یہودی خود کو ایک عجیب صورت حال سے دوچار پاتے ہیں۔ پچھلے دو ہزار سالوں میں یہ پہلا موقع ہے جب ارضِ فلسطین میں ایک اسرائیلی ریاست نہ صرف یہ کہ قائم ہے بلکہ دنیا کی واحد سُپر پاور اس کی اطاعت کا دم بھرنے پر مجبور ہے۔ عملی طور پر یروشلم اسرائیلی ریاست کا حصّہ ہے لیکن اس کے باوجود اہلِ یہود کے لیے اب تک یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ وہ تیسرے معبد کی شکل میں اپنے دیرینہ خواب کی تکمیل کر پاتے۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کا قیام یہودیوں کے لیے ایک معجزہ سمجھا جاتا تھا اور جب ۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں غیر متوقع طور پر یروشلم کا مقدس شہر بھی اسرائیل کی جھولی میں آ گرا تو پوری یہودی دنیا ایک طرب انگیز کیفیت سے دوچار ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوا گویا خدا نے دوبارہ اہلِ یہود پر اپنا دستِ شفقت رکھ دیا ہے۔ لیکن اس طرب انگیز ایام میں بھی اگر اہلِ یہود بیت المقدس کے علاقے میں تیسرے معبد کی بنیاد نہ رکھ سکے تو اس کی وجہ بڑی حد تک فقہی اور مذہبی پیچیدگیاں تھیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہودی فقہ کے مطابق اس وقت تمام یہودی عالمِ ناپاکی میں ہیں اور ایسی حالت میں اگر کوئی شخص تیسرے معبد کی حدود میں قدم رکھے گا تو اس کی سزا موت ہے۔ طہارت کے لیے لازم ہے کہ ایک ایسی سرخ گائے کی راکھ سے تیمّم کیا جائے جس کی قربانی ایک کاہن کی نگرانی میں عمل میں آئی ہو۔ معبد کے لئے مقامِ محراب (alter) کا تعین بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مقام کا تعیّن عام ربائیوں کے بس کی بات نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب دوسری دفعہ معبد کی تعمیرِ نو ہوئی تھی تو اس وقت ایسے مشاہدین موجود تھے جو اس مقام کی نشان دہی کر سکیں لیکن آج اس مقامِ مقدس کی نشان دہی کے لیے دنیا میں کوئی شخص موجود نہیں۔ اہلِ یہود کا ایمان ہے کہ تیسرے معبد کی تعمیر سے پہلے ان کے ایک برگزیدہ پیغمبر علیجاہ کا ظہور ہو گا جو وثوق کے ساتھ اس مقام کی نشاندہی کر سکے گا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تیسرے معبد کی تعمیر علیجاہ کی نگرانی میں ہو گی۔ سرخ گائے کی قربانی کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ اہل یہود میں ایک ربائی اعظم موجود ہو جسے اکہتّر ربائیوں کی مجلس (Sanhedrin) نے منتخب کیا ہو۔ اس مجلس کا رکن ہونے کے لیے لازم ہے کہ متعلقہ ربائی کی سند یا فقّی کا سلسلہ سینہ بہ سینہ حضرت موسیٰ تک جا پہنچتا ہو۔ مصیبت یہ ہے کہ اہلِ یہود کے اپنے تاریخی بیان کے مطابق عیسائی حکمراں قسطنطین (Constantine) کے استبدادی ہتھکنڈوں کے زیرِ اثر ۳۵۸ء میں یہودی ربائی روایت کا یہ تسلسل ٹوٹ گیا۔ پھر یہودی دنیا ابھی تک اس مسئلہ کا بھی کوئی حل دریافت نہیں کر پائی ہے کہ تیسرے معبد کی تعمیر سے قبل اہلِ یہود کے حتمی نجات کے لیے جن دوسرے دس گُم شدہ قبائل کی واپسی لازمی ہے وہ اس وقت کہاں ہیں اور کب آئیں گے۔ بعض یہودی روایتوں کے مطابق مسیحا کی آمد سے قبل پیغمبر علیجاہ کا ظہور ہو گا۔ اور چوں کہ علیجاہ سینہ بہ سینہ ربائی سلسلے میں حضرت موسیٰ سے جا ملتے ہیں، ان کے بارے میں یہ خیال بھی عام ہے کہ وہ یہودیوں کی مجلس اعلیٰ (Sanhedrin) کی تنظیمِ نو کریں گے۔

یہ ہے وہ منظر نامہ جس نے اہلِ یہود کو تمام تر قوت وسطوت کے باوجود تیسرے معبد کی تعمیر سے روکے رکھا ہے۔ رہے سیکولر یہودی تو وہ انتظار کی زحمت میں اپنا وقت گنوانا نہیں چاہتے۔ سچ پوچھیے تو ریاست اسرائیل کا قیام سیکولر اور (Zionist) یہودیوں کی کوششوں سے ہی ممکن ہوسکا ہے۔ مذہبی یہودیوں کے بعض حلقے آج بھی ریاست اسرائیل کو خدائی اسکیم کے خلاف ایک مصنوعی عمل سمجھتے ہیں۔ وہ اس خیال کا اظہار کرتے نہیں تھکتے کہ جب تک اہلِ یہود کی وافر تعداد اسرائیل میں جمع نہ ہوجائے تیسرے معبد کی تعمیر کا کوئی جواز نہیں ہے۔ بعض حلقوں سے ایسی آوازیں بھی آتی رہتی ہیں کہ ارضِ کنعان میں مستقبل کی جنگ میں چوں کہ اہلِ یہود کی غالب آبادی کا صفایا ہونا ہے اس لیے اہلِ یہود کے ارتکاز کی یہ مصنوعی کوشش ایک شیطانی اسکیم کا حصّہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان مختلف الآراء آوازوں کے باوجود آج اسرائیلی ریاست ایک حقیقت ہے۔ سیکولر یہودی تمام حلاقائی یا فقہی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی بالادستی کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں۔ البتہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود معبد کی تعمیر کا کام اگر اب تک سرد مہری کا شکار رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آگے کا مرحلہ فقہ یہود میں ایک بڑی اور بنیادی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔ سیکولر یہودیوں کو اس خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے کہ اگر معبد اپنے پُرانے قالب میں تمام تر جزئیات کے ساتھ وجود میں آ بھی گیا تو جانوروں کی اتنے بڑے پیمانے پر قربانیاں، خون چھڑکے جانے کی رسم اور گوشت کے جلتے رہنے کی ناگوار مہک کیا موجودہ دنیا کے لیے قابلِ قبول ہوسکے گی؟ دیکھا جائے تو یہودی جاہ وحشم کا یہ منصوبہ جس میں معبد کی تیسری تعمیر کو مرکزی مقام حاصل ہے، ایک پیچیدہ فقہی حصار میں پھنس کر رہ گیا۔

دوسری طرف ایک مفروضہ خدائی منصوبے کو مصنوعی طریقے سے مہمیز دینے کی سیکولر مساعی بھی مسائل سے دوچار ہے۔ اُنیسویں صدی میں جب مشرقی یورپ کے یہودی اہلِ فکر نے یہودیوں کو ارضِ فلسطین کی طرف مراجعت کا مشورہ دیا تھا اس وقت یہ دلیل سامنے لائی گئی تھی کہ مسیحا کی آمد کا وقت قریب ہے سو تمام دنیا کے یہودیوں کو چاہیے کہ وہ فلسطین میں مسیحا کے استقبال کے لیے جمع ہوں۔ اس فقہی حیلِ نے فلسطین میں یہودی آبادکاری کے منصوبے کو ایک مذہبی تحریک کی شکل دے دی۔ جو آگے چل کر ایک سیکولر، غیر توراتی ریاست، اسرائیل کے قیام پر منتج ہوئی۔ سیکولر یہودی کوئی ساٹھ برسوں سے قومِ یہود کی مذہبی فکر میں اسرائیل کو کلیدی مقام عطا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ریاست اسرائیل میں یہودی آبادکاری کو ایک مذہبی فریضہ کے طور پر پیش کیا حتّٰی کہ آج اسرائیل کے مختصر سیاحتی سفر کو بھی عالیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ پوری دنیا کے یہودیوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ان کی زندگی کا مقصدِ وحید ریاست اسرائیل کو استحکام پہنچانا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس ہنگامہ خیز تحریک کے نتیجے میں دنیا کے مختلف خطّوں سے لاکھوں یہودیوں نے اسرائیل کو اپنا مسکن بنایا ہے لیکن اب ساٹھ سالوں کے بعد صاف محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کو مہمیز کرنے کی مصنوعی کوشش بہت تیزی سے اپنا اثر کھو رہی ہے۔ اوّلاً ساٹھ سالوں کی سرتوڑ جدوجہد

کے باوجود یہودیوں کی غالب آبادی اب بھی اسرائیل سے باہر ہے جس کے بغیر مسیحا کی آمد کا خیال عبث ہے۔ ثانیا ۴۸ء میں قیام اسرائیل کے وقت اور ۶۷ء میں اسرائیل کی غیر متوقع فتح کے بعد اہلِ یہود کے سروں پر خدائی دست شفقت کا جو احساس پایا جاتا تھا، وہ مقدس بخار اب بڑی حد تک رخصت ہو چکا ہے۔ یہودیوں کی نئی نسل اسرائیل کے سلسلے میں نہ صرف یہ کہ سرد مہری کا شکار ہے بلکہ بعض سروے پر اگر یقین کیا جائے تو نوجوان یہودیوں (عمر ۱۸ تا ۲۹ سال) کی ایک تہائی آبادی اسرائیل سے ہجرت کرنے کی سوچ رہی ہے۔ مغرب میں پروان چڑھنے والی نئی یہودی نسل اس نکتے کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد ہزاروں میل دور ایک ریاست کو استحکام فراہم کرنا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ نئی نسل اسرائیلی حکمرانوں کی بدعنوانیوں اور ان کے جنگجویانہ عزائم کی بھی شاکی ہے۔ یہودی دانشوران نوجوانوں کو ٹھنڈے یہودی (Cool Jew) کا نام دیتے ہیں۔ گویا ساٹھ سال پہلے اسرائیل کا وجود جس طرح مختلف یہودیوں کے لئے نقطۂ اتحاد تھا اور جس نے دو ہزار سالہ بے وطن یہودی شناخت کو ایک نقطۂ اتصال عطا کیا تھا اب اس کا سحر بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے۔ یہودی تنظیمیں اس صورت حال پر ماتم کناں ہیں کہ ہندوستان میں تفریح کی غرض سے آنے والے بہت سے یہودی نوجوان پُرسکون زندگی کا لطف لینے کے بعد دوبارہ اسرائیل واپس جانا نہیں چاہتے۔

یہودی نقطۂ نظر سے اگر مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ دو سو سال کی شب و روز جد و جہد کے باوجود اہلِ یہود ابھی اپنے اہداف سے خاصے دور ہیں اور شاید اس راہ کی فقہی اور حلاقائی پیچیدگیاں آنے والے دنوں میں بھی ان کا راستہ روکے رکھیں۔ ہاں اس پورے قضیے میں یہ ضرور ہوا کہ روایت پرست عیسائی حلقوں نے مسیح کی آمد ثانی کی راہ ہموار کرنے کے لیے یہودی قوم کو مسلسل ان مسلمانوں سے نبرد آزما کر رکھا ہے جن کے سایۂ عاطفت میں یہودی قوم نے صدیوں پُرامن اور پُرسکون زندگی کا لطف لیا ہے اور جس کے تاریخی شواہد سے یہودی مؤرخین کی کتابیں بھی خالی نہیں۔ مسیح کی آمد ثانی کے شوق میں عیسائی حلقوں نے تاریخ کو جس سرعت کے ساتھ آگے لے جانا چاہا ہے اس کی سب سے بڑی قیمت اہلِ یہود کو چکانی پڑی ہے۔ ان کی مذہبی شناخت جو پچھلے دو ہزار سالوں سے (galute) یا جلاوطنی سے عبارت تھی ایک خالصتاً سیکولر، غیر توراتی ریاست کے تابع ہو کر رہ گئی ہے۔ ارضِ فلسطین میں یہودی حکمرانی اور آبادکاری کا سامان تو فراہم ہو گیا لیکن داؤد و سلیمان کا روحانی اور اخلاقی ورثہ قصّۂ پارینہ بن گیا۔ Temple Mount پر خدا کی تقدیس کا جلوہ اب بھی ان کی رسائی سے دور ہے۔ ایک غیر توراتی ریاست اور اس کے کارندے ایک خالص مذہبی نوعیت کے پروجیکٹ میں خود کو اجنبی محسوس کرتے ہیں۔ ساٹھ سال گزرنے کے بعد، اب بھی ریاست اسرائیل کے باشندے اس بنیادی سوال سے دوچار ہیں کہ وہ مختلف ملکوں سے پُرآسائش زندگی چھوڑ کر یہاں کس لیے جمع ہیں۔ مسیحا کب آئے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ عیسائی زائچہ نویسوں کے آلہ کار بن گئے ہوں جو بہر قیمت مسیح کی

آمدثانی کے لیے مشرق وسطیٰ میں ایک آرمیگاڈان برپا کرنا چاہتے ہیں۔ گذشتہ دنوں (Harzliya) کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے ایک نوبل انعام یافتہ یہودی عالم پروفیسر اسرائیل اومان نے اسی سنگین صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خبردار کیا تھا کہ ریاست اسرائیل فی زمانہ اپنے وجود کے خطرے سے دوچار ہے اور یہ اس صورت حال کا لازمہ ہے جسے ہم (Post-Zionism) کہہ سکتے ہیں۔

اس دوران گوکہ مسلم دنیا اہلِ یہود کے اساطیری ذہن کی مسلسل زد پر رہی ہے۔ البتہ ہماری طرف سے اس اساطیری ذہن کے مالہ و ماعلیہ کو سمجھنے کی سنجیدہ اور ہمدردانہ کوشش شاید اب تک نہیں کی گئی ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان جو نظری طور پر تمام اقوام عالم کی مسیحائی پر مامور ہیں علمائے یہود کو اس اساطیری طرزِ فکر سے نجات دلانے کی کوئی باقاعدہ کوشش نہ کرتے۔ ایسا اس لیے بھی ہوا کہ ابتدائی مراحل میں فلسطینی مزاحمت کاروں کی قیادت پر سیکولر ذہن کا غلبہ تھا جو مسئلہ فلسطین کو ایک خالص قومی جدوجہد سمجھتے تھے۔ البتہ بعد کے ایّام میں بالخصوص ۶۷ء کی جنگ کے بعد جب سیکولر قیادت کا اعتبار جاتا رہا اور رفتہ رفتہ اس کی جگہ دینی تنظیموں نے لے لی تو اس جدوجہد کی قیادت بڑی حد تک مذہبی قائدین کے ہاتھوں میں آ گئی جن کا مؤقف یہ تھا کہ ارضِ فلسطین کی حیثیت چوں کہ وقف اراضی کی ہے جس پر تمام امّت کا مشترکہ ورثہ ہے اس لیے اس سرزمین کے کسی حصّے کا بھی سودا نہیں کیا جا سکتا۔ جہادی تنظیموں نے مسئلہ کو عسکری طور پر حل کرنے کی کوشش کی جس سے بیسویں صدی میں جذبۂ شہادت کی عظیم تاریخ لکھنے میں تو ضرور مدد ملی البتہ اسرائیلی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا ہدف ہنوز ایک دورافتادہ خیال ہے۔ ساٹھ سالہ کشت وخون کے بعد اہلِ یہود کو اب یہ فکر ستانے لگی ہے کہ محض قوت کے بل پر مسلسل خوف اور نفرت کے ماحول میں نہ تو کسی ریاست کی صحت مند تعمیر ہو سکتی ہے اور نہ ہی نئے مستقبل کی اُمید میں پوری قوم کو بہت دنوں تک انتظار میں رکھا جا سکتا ہے۔ یہودی شدّت پسندوں میں دوریاست کے فارمولے کی قبولیت اور فلسطینی جاں بازوں میں اس خیال کے لیے نرم گوشہ ہونا اسی بات کی غمّازی کرتا ہے کہ دونوں طرف اس بندگلی سے نکلنے کی ضرورت کا احساس پایا جاتا ہے۔ سچ پوچھیے تو اب تک مسئلہ فلسطین پر مسلمان محض مزاحمت کی پالیسی پر عمل پیرا رہے ہیں۔ وہ دوسروں کی پیش کردہ تجاویز پر ہی ردّعمل ظاہر کرتے رہے ہیں۔ خود ان کی طرف سے اقدامی عمل کا ڈول ڈالا جانا ابھی باقی ہے۔

شاید اب وقت آ پہنچا ہے کہ مسلمانوں کے اہلِ فکر کمال ہمدردی اور نصح وخیرخواہی کے جذبے کے ساتھ یہودی ذہن کو ان اساطیری گرداب سے نجات دلانے کے لیے سامنے آئیں جس نے نہ صرف یہ کہ یہودی دنیا کو ایک سرابِ مسلسل کے تعاقب میں مبتلا کر دیا ہے بلکہ اس خیال نے توحید کی حامل دو قوموں کو گذشتہ نصف صدی سے باہم برسرِ پیکار کر رکھا ہے۔ خیرامّت کی حیثیت سے مسلمانوں کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ علمائے اہلِ کتاب کو ان التباساتِ فکری سے نکلنے میں مدد دیں جس کے سبب

آنے والے دنوں میں فلسطین کی سرزمین کے ملحمۂ کبریٰ میں تبدیل ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب مسلم اہلِ فکر اہلِ یہود کے خدا ترس علماء کا مؤقف سمجھنے کے لیے انھیں مکالمے کی دعوت دیں۔ ہماری طرف سے اہلِ یہود کو یہ پیغام جانا چاہیے کہ ہم کوئی اور نہیں براہیمی سلسلے کے آخری امین ہیں۔ اگر تمھاری توقعات کے مطابق آنے والے دنوں میں مسیح کا واقعی ظہور ہو جاتا ہے تو ہم حضرت مسیح پر بیت المقدس کا سنہری دروازہ بند کرنے کی جسارت کیسے کر سکتے ہیں۔ کیا اہلِ یہود کے حق پرست افراد ہماری صدیوں پر محیط فیاضانہ میزبانی سے انکار کر سکتے ہیں؟ کیا وہ ہم نہیں تھے کہ جب خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کی قیادت میں فلسطین میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے تو Mount Morya کی عظمت کی بحالی کی خاطر اسے دوبارہ خدائے واحد کے سجدوں سے آباد کیا تھا تب ہمیں یہ گوارہ نہ ہوا کہ داؤد سلیمان کی باقیات کو کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بنا رہنے دیں۔ وہ ہم ہی تھے جس نے ۱۳۵۹ء میں دیوارِ گریہ کی نشان دہی کی تھی اور یہ کہہ کر اسے اہلِ یہود کے حوالے کیا تھا کہ شاید یہ تمہارے معبد کی باقیات میں ہو۔ خدائے واحد کے آگے دیوارِ گریہ کے سایے میں تمھاری عبادتوں کو ہم تب بھی فال نیک تصوّر کرتے تھے اور آج بھی جب اہلِ یہود اور مسلمانوں کے مابین نفرتوں کی فصیل کھڑی ہو گئی ہے ہم تمہاری عبادتوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آنے والے دنوں میں اگر مسیح کا واقعی ظہور ہو گیا تو ہم ان کے لیے دل و نگاہ بچھانا اپنی خوش بختی نہ سمجھیں گے۔ گو کہ آنے والا آ چکا اب وہ کبھی نہ آئے گا۔ لیکن تم ماضی کے طلسم میں گرفتار ایک خیالی دنیا کی اُمید لیے بیٹھے ہو۔

دوسری طرف کچھ یہی حال عیسائی روایت پرستوں کا ہے جو مسیح کی آمد ثانی کے لیے تمہارے ہاتھوں ملحمۂ کبریٰ برپا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مستقبل کے سلسلے میں یہ موہوم اندیشے مسلمانوں میں نہیں پائے جاتے۔ ہمارے یہاں بھی بعض حلقے مسیح کی آمد ثانی اور بعض حلقے امام غائب کے ظہور کے منتظر ہیں بلکہ بعض روایتوں کے مطابق تو انھوں نے دمشق میں سفید گنبد کے اوپر فرشتوں کے جلو میں بادلوں کے سایے میں مسیح کے نزول کی تفصیلات بھی مرتّب کر رکھی ہیں۔ تم ان باتوں کو کج فکری پر محمول کرو یا اسے حقیقت جانو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کشت و خون کے اس سلسلے کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے جب تک کہ مستقبل کا مطلع پوری طرح صاف نہیں ہو جاتا کہ اگر مسیح کا نزول واقعتاً دوبارہ ہوتا ہے تو تم ہمیں ان کی قیادت میں اپنے ساتھ شریک و سہیم پاؤ گے۔ قرآن کا مؤقف ہے کہ "فی قومِ موسیٰ امة یهدون بالحق" ہم پر لازم ہے کہ ہم قومِ موسیٰ کے خدا ترس نفوس کو بلا پس و پیش ایک بے تکلّف مباحثے کی دعوت دیں جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے۔ یا﴿ اهل الكتاب تعالوا الىٰ كلمةٍ سواءٍ بيننا و بينكم﴾۔

مسلمانوں میں جب یونانی علوم کے زیر اثر کلامی بحثوں کا سلسلہ چل نکلا اور جب اس صورتِ حال نے ایک دانشورانہ انار کی کی کیفیت پیدا کر دی تب پہلی بار یہ سوال ہمارے لیے اہمیت اختیار کر گیا کہ کون سے علوم واقعتاً مفید ہیں اور کن علوم کو لائق استرداد سمجھنا چاہیے۔ شرعی اور غیر شرعی علوم کی تقسیم نے اگر ایک طرف معقولات کے سیلاب کو روکنے میں مدد دی تو دوسری طرف آگے چل کر اس سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ بہت سے مفید علوم، علومِ شرعی کی تعریف سے باہر رہ گئے۔ علوم شرعی کا محدود تصور جس سے خود اب قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ باہر رہ گیا تھا اور جس کا انفس و آفاق میں غور فکر کی دعوت دینے والی تمام آیات احاطہ نہیں کرتی تھیں مسلم ذہن کو بہت جلد ایک ایسی بند گلی میں لے گیا جہاں سے اس کا نکلنا آج بارہ صدیوں کے بعد بھی ممکن نہیں ہو سکا ہے۔